قرضوں کی اشاریہ بندی۔ شرعی نقطہ نظر

محمد طاہر منصوری ☆

فکرونظر کے گذشتہ تین شماروں میں شاہ محی الدین ہاشمی صاحب کے استحکام قدر زر اور اشاریہ بندی سے متعلق تین مقالات طبع ہوئے۔ اسی موضوع سے متعلق جناب طاہر منصوری صاحب کا زیر نظر مقالہ ہمیں موصول ہوا' جس میں شاہ صاحب محترم کے نتائج تحقیق سے اختلاف کیا گیا ہے۔

(مدیر)

افراط زر اور اس کے نتیجہ میں سرمایہ کو پہنچنے والے نقصان کا مسئلہ معاصر معیشت کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ غیر مستحکم قیمتوں کا نظام معیشت معاشرے کے تقریباً تمام ہی طبقات کو متاثر کرتا ہے۔ محدود آمدن والے افراد خاص طور پر اس کا نشانہ بنتے ہیں۔ طویل المیعاد مالی معاہدات اور موجل ادائیگیوں پر بھی اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں۔ جدید ماہرین معیشت کے ایک حلقہ نے اس مشکل کا حل اشاریہ بندی میں ڈھونڈا ہے۔ لیکن مسلمان علماء اور ماہرین معیشت کی ایک معتدبہ اکثریت نے قرضوں اور موجل ادائیگیوں کی اشاریہ بندی کو قبول نہیں کیا اور شرعی بنیادوں پر اسے شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تجویز ان حلقوں میں خوب سراہی گئی ہے جو بینک کے سود کو جائز دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ انہیں اشاریہ بندی کی صورت میں سود کے جواز کیلئے ایک نئی دلیل ہاتھ آ گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بینک اپنے کھاتہ دار کو اصل زر پر جو اضافہ دیتا ہے وہ سود نہیں بلکہ اس نقصان کی تلافی ہے جو افراط زر کی وجہ سے اس کے سرمایہ کو پہنچا ہے۔

☆ لیکچرر' شریعہ فیکلٹی' بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد

اسی موضوع کے حوالہ سے "فکرونظر" کے گذشتہ تین شماروں میں جناب شاہ محی الدین صاحب کے نہایت اہم اور فکر انگیز تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک درست مسئلہ کی نشاندہی کی ہے۔ تاہم ان کے مقالات میں اٹھائے گئے بہت سے نکات قرض کے لین دین کے بارے میں شریعت کی تعلیمات اور اس مسئلہ پر پائے جانے والے امت مسلمہ کے اجماع اور تعامل کے خلاف ہیں۔ قرضوں کی اشاریہ بندی سے متعلق ان کا نقطۂ نظر جہاں مسلم معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات کی اخلاقی و روحانی اساس کی نفی کرتا ہے وہاں ان کوششوں سے بھی متصادم ہے جو ملک میں غیرسودی نظام معیشت کے نفاذ کیلئے کی جا رہی ہیں۔

اس پس منظر میں یہ ضروری ہے کہ ان کے موقف کا شرعی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ نیز یہ بھی دیکھا جائے کہ اشاریہ بندی اقتصادی لحاظ سے کس حد تک قابل عمل ہے اور کہاں تک "قرین انصاف" اور "مقتضائے شرع" ہے۔

ان کے مقالات میں اٹھائے گئے نکات مختصراً درج ذیل ہیں۔

۱۔ کاغذی نوٹ حقیقی زر نہیں کیونکہ ان کی حقیقی قدر (Real Value) کوئی نہیں ہوتی۔

۲۔ کاغذی نوٹ افراط زر کا باعث ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمائے کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔

۳۔ دائن کے سرمایہ میں کمی کی تلافی مقروض کی شرعی و اخلاقی ذمہ داری ہے۔

۴۔ زر کی قدر کے تغیر و بے ثباتی کے پیش نظر قرضوں کی واپسی میں "عددی مثلیت" کی بجائے روپے کی بازاری قدر (Market Value) یا اس کی قوت خرید کا لحاظ رکھا جانا چاہئے۔

۵۔ قرضوں کی اشاریہ بندی روپے کی قوت خرید میں کمی کا ایک منصفانہ حل ہے اور شرعی اصولوں کے مطابق ہے۔

۶۔ فقہاء احناف فلوس کی ارزانی و گرانی کی حالتوں میں مثلیت کی بجائے ان کی قیمت یا بازاری قدر کے حامی ہیں۔

۷۔ ربا کی حرمت علت کے ساتھ منسلک ہے اور وہ ظلم ہے۔

کیا کاغذی نوٹ حقیقی زر نہیں ؟

فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ کاغذی زر حقیقی

زر نہیں۔ وہ کاغذی نوٹوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہ اکیڈمی کی اس قرار داد کو غلو اور افراط سے تعبیر کرتے ہیں جس میں کاغذی نوٹوں کو شرعی احکام کے اعتبار سے درہم و دینار کے مشابہہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کی یہ بات کئی اعتبار سے خلاف حقیقت ہے۔

ا۔ فقہ کی قدیم و جدید کتب میں کہیں بھی ثمن یا نقدی کو سونے و چاندی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا گیا۔ بلاذری کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ۔ نے اپنے دور میں اونٹوں کی کھال سے درہم بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ اس طرح تو اونٹ ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ سن کر آپ نے ارادہ ترک کر دیا (۱)

امام مالک "المدونۃ الکبری" میں فرماتے ہیں:

ولو ان الناس اجازوا بینھم الجلود حتی یکون لھا سکۃ وعین لکرھتھا ان تباع بالذھب والورق نظرۃ۔ "اگر لوگ چمڑے کو زر کے طور پر اختیار کر دیں تو میں اس چمڑے کو سونے و چاندی کے بدلے ادھار پر فروخت کو ناجائز سمجھتا ہوں" (۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چمڑہ کی کرنسی بن جائے تو اس میں بھی ربا اور صرف کے وہی احکام جاری ہوں گے جو درہم و دینار میں ہوتے ہیں۔ اس عبارت سے ضمناً اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ "حکومت چمڑہ یا کسی بھی دوسری چیز کو کرنسی کے طور پر اختیار کر سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "درہم و دینار میں "ثمنیت" کا علت ربا ہونا ایک مناسب و درست علت ہے کیونکہ ثمن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اموال کی قیمت و مقدار جانچنے کا ایک معیار ہو۔ خود اس کی ذات سے انتفاع مقصود نہیں ہوتا"۔ (۳)

ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء کے ایک فتوی میں آپ کا ایک اور قول یوں نقل کیا گیا ہے: "درہم و دینار کی اپنی ذاتی اور شرعی کوئی حیثیت نہیں۔ ان کا ثمن ہونا دراصل عرف و عادت کی وجہ سے ہے۔ درہم و دینار اپنی ذات میں مقصود و مطلوب نہیں بلکہ لوگوں کے مالی معاملات کیلئے یہ ایک معیار ہیں۔ اس طرح یہ محض ایک وسیلہ ہیں اور وسیلہ اپنی ذات میں مقصود و مطلوب نہیں ہوتا"۔ (۴)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ ؒ کے نزدیک سونا و چاندی کسی متبرک و مقدس کرنسی کی حیثیت نہیں رکھتے کہ ان سے انحراف کرنا جائز نہ ہو بلکہ ان کی نگاہ میں اشیاء کو

جانچنے کیلئے کسی بھی چیز کو معیار بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ عرف عام میں اسے قبولیت حاصل ہو۔

معاصر علماء نے رائج کرنسی کو مکمل طور پر درہم و دینار کے مشابہہ قرار دیا ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف فقہ الزکوۃ میں لکھتے ہیں:

"صورت حال یہ ہے کہ یہ نوٹ لوگوں میں معاملات کی اساس بن چکے ہیں اور اب سونے اور چاندی کے سکوں کو وہ دیکھ بھی نہیں پاتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو معمولی مقدار میں ہوتے ہیں۔ اب معاملات اور ثروت کی اساس یہی کاغذی نوٹ بن چکے ہیں۔ قانونی اداروں کے اعتماد اور معاملات کی خوش اسلوبی سے روانی کی بنا پر یہ کاغذی نوٹ ہی اشیاء کی قیمت قرار پا چکے ہیں۔ غرض ان کاغذی نوٹوں کو ضروریات پورا کرنے، تبادلہ کرنے اور کسب معاش و منافع میں وہی قوت حاصل ہے جو سونے اور چاندی کی قوت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے کاغذی نوٹ سونے اور چاندی کی طرح افزائش پذیر اور اموال نامیہ ہیں"۔ (۵)

اپنی دوسری کتاب "فوائد البنوک ہی الربا المحرم" میں لکھتے ہیں: "ان نوٹوں سے ہم خرید و فروخت میں قیمت ادا کرتے ہیں، مزدور کو اجرت دیتے ہیں، نکاح میں مہر ادا کرتے ہیں، قتل خطا میں دیت ادا کرتے ہیں۔ اور آدمی ان نوٹوں کو چوری کر لے تو دنیا کے تمام قوانین میں اس پر چوری کی سزا لازم آتی ہے۔ پھر آخر انہیں نقدی کیوں نہ قرار دیا جائے" (۶)

علامہ رشید رضا نے بھی اپنی کتاب "یسر الاسلام و اصول التشریع" میں کاغذی نوٹوں کو ایک مستقل کرنسی قرار دیا ہے جس میں ربا کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ (۷) مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی اپنی کتاب "کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم" میں تفصیل کے ساتھ کرنسی نوٹوں کی ثمنیت اور ان پر مرتب ہونے والے فقہی احکام کا جائزہ لیا ہے اور انہیں فقہی احکام کے اعتبار سے سونے و چاندی کے مشابہہ قرار دیا ہے۔ (۸)

کرنسی نوٹوں کی ثمنیت کا اعتراف ہمیں کئی مستند معاصر کتب میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی کے مطابق شرکت و مضاربت کا رأس المال درہم و دینار یا کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہونا چاہئے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "شرکت کے درست ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس کا سرمایہ درہم و دینار (سونا و چاندی) یا مروج کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہو" (۹)

۲۔ کاغذی نوٹوں کی اس حیثیت پر علماء امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ عالم اسلام کی فقہی مجالس

اور مختلف کانفرنسوں میں اس موضوع پر متعدد قرار دادیں منظور کی جا چکی ہیں۔

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے اجلاس ۱۱ ۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں درج ذیل قرار داد منظور کی گئی۔

"کاغذی نوٹ فقہی اعتبار سے "نقود اعتباریہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ثمنیت مکمل طور پر موجود ہے۔ شریعت میں ربا' زکوٰۃ' سلم وغیرہ کے معاملہ میں سونے اور چاندی کے جو احکام طے شدہ ہیں' وہی احکام ان نوٹوں پر بھی جاری ہونگے" (۱۰)

اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی معاشیات اسلام آباد کے اشتراک سے جدہ میں انڈیکسیشن کی شرعی حیثیت کے بارے میں ہونے والے سیمینار منعقدہ ۲۵۔ ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء میں درج ذیل قرار داد منظور کی گئی:

"کرنسی نوٹ اس اعتبار سے سونے و چاندی کے سکوں کی جگہ ہیں کہ ان میں سود' زکوٰۃ و سلم کے احکام جاری ہوتے ہیں اور وہ مشارکت و مضاربت کا راس المال بنتے ہیں" (۱۱)

ان آراء کی روشنی میں صاحب مقالہ کا یہ اعتراض بے محل ہو جاتا ہے کہ کاغذی نوٹوں کی اپنی اصل قدر (Intrinsic Value) نہیں ہے۔ عرف میں ان نوٹوں کو کرنسی کی حیثیت حاصل ہے' تبادلہ اشیاء کے وسیلے اور انہیں ناپنے کے معیار کے طور پر لوگ انہیں قبول کرتے ہیں اور ان کی پشت پر حکومت کی ضمانت موجود ہے لہٰذا وہ ایک مکمل شرعی کرنسی ہیں۔

مزید برآں' سونے و چاندی کی کرنسی پر اصرار ریاست کیلئے ایک غیر ضروری زحمت کا بھی موجب ہے جبکہ شریعت کے احکام میں سہولت و آسانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ریاست کے پاس سونے و چاندی کے اتنے وسیع ذخائر نہ ہوں کہ انہیں سکوں میں ڈھالا جائے اس کے علاوہ ریاستیں بعض اوقات قیمتی معدنیات کو بیرونی تبادلوں اور اہم ضروریات کیلئے بھی محفوظ رکھتی ہیں۔ لہٰذا درہم و دینار کو کرنسی بنانا کوئی شرعی تقاضا نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عرف و عادت کو شریعت میں مصدر تشریع کی حیثیت حاصل ہے' عرف میں ان نوٹوں کو ثمن کی حیثیت حاصل ہے' وہ تبادلہ اشیاء کے وسیلے' حساب کتاب کی اکائی اور اشیاء کو ناپنے کے معیار کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس پس منظر میں انہیں کیوں نہ شرعی کرنسی تصور کیا جائے۔

فاضل مقالہ نگار نے زر حقیقی اور زر کاغذی کے درمیان فرق کی جو گفتگو کی ہے' وہ محض ایک نظری بحث ہے' اس کی کوئی عملی افادیت نہیں۔ اس بات سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ "ذاتی حیثیت میں کاغذی زر سے نہ پیٹ بھرتا ہے' نہ بدن ڈھکتا ہے اور نہ یہ زیب و زینت کے کام آتا ہے"۔ سوال یہ ہے کہ کیا کاغذی زر میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس سے انسان کھانے کی اشیاء خرید کر پیٹ بھرے' کپڑا خرید کر جسم ڈھانکے۔ زر کا ذاتی کام اگر پیٹ بھرنا اور بدن ڈھانکنا ہی ہے تو یہ کام تو درہم و دینار نے بھی کبھی انجام نہیں دیا۔ کرنسی نوٹوں کی طرح انہیں بھی دوسری اشیاء میں تبدیل کر کے ہی استعمال کیا جاتا تھا (رہی زیب و زینت کی بات تو یہ فریضہ تو نوٹوں کے ہار خاصے عرصہ سے انجام دے رہے ہیں)۔

صاحب مقالہ نے درہم و دینار اور کاغذی نوٹوں کے درمیان ایک دلچسپ فرق بیان کیا ہے' وہ یہ ہے کہ "دراہم و دینار میں ثمنیت و وزن کا اعتبار کیا جاتا ہے جبکہ کاغذی نوٹوں میں ایسا نہیں"۔ وہ لکھتے ہیں: "چنانچہ پچاس روپے کے ایک نوٹ کے عوض ایک روپے کے پچاس نوٹ دیئے جائیں تو یہ ربوا نہیں ہو گا حالانکہ عدد اور وزن بڑھ گئے ہیں"۔

بہتر ہوتا کہ وہ یہ فرق بیان کرنے کے بعد یہ بھی بتا دیتے کہ اس گفتگو سے کیا ثابت ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک کرنسی اسی وقت شرعی اور حقیقی کہلائے گی جب اس میں ثمنیت اور وزن کا اعتبار ہو گا اور چونکہ کاغذی نوٹ ثمنیت سے محروم ہیں اور ان کا تبادلہ وزن کے ذریعہ بھی نہیں ہوتا لہٰذا وہ شرعی و حقیقی کرنسی نہیں۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ نقدین میں گنتی و وزن کی شرط کسی نص پر مبنی نہیں بلکہ یہ خالصتاً عرف و عادت کا معاملہ ہے۔ نص کا تقاضا صرف مماثلت و برابری کا ہے۔ یہ برابری وزن کی جانے والی اشیاء میں وزن کے ذریعہ' گنی جانے والی اشیاء میں گنتی کے ذریعہ اور ناپی جانے والی اشیاء میں ناپ کے ذریعہ متحقق ہوتی ہے۔ گویا عرف و عادت اس برابری کے پیمانے اور معیار کا تعین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء مالکیہ و شافعیہ نے نقدین میں علت صرف ثمنیت کو قرار دیا ہے۔ وزن و گنتی کے مسئلہ کو عرف و رواج پر چھوڑ دیا ہے (۱۲) کرنسی نوٹوں میں مطلوب مماثلت و برابری کا مسئلہ بھی عرف و عادت پر ہی چھوڑا جائے گا۔ اب چونکہ عرف میں نوٹوں کے وزن و عدد کا نہیں بلکہ مقدار و قیمت کا لحاظ رکھا جاتا ہے لہٰذا مقدار و قیمت میں اضافہ ربوا متصور

ہو گا چاہے تبادلے میں دونوں طرف کے نوٹ وزن کے حساب سے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ پچاس روپے کے ایک نوٹ کے بدلہ میں پچاس روپے کا ایک ہی نوٹ دے دیا جائے یا دس دس کے پانچ نوٹ۔ مقدار اور قیمت تو بالآخر ایک ہی رہتی ہے۔ اگر کرنسی میں وزن و عدد ہی کی مماثلت مطلوب ہے' جو صاحب مقالہ کا مدعا و مقصود معلوم ہوتی ہے' تو کیا یہ جائز ہوگا کہ دس دس روپے والے پانچ نوٹوں کا سو سو روپے والے پانچ نوٹوں سے تبادلہ کر دیا جائے؟

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ کاغذی زر کو اس لئے زکوۃ اور دیگر مالی نصابات میں بطور معیار معتبر نہیں سمجھا گیا کہ اس کی قدر و قیمت تغیر و بے ثباتی کا شکار رہتی ہے۔

یہ مسئلہ کی غلط توجیہ ہے۔ اگر فقہاء نے کاغذی نوٹ کو زکوۃ کا معیار نہیں سمجھا تو اس کی وجہ اس کی قدر کی بے ثباتی یا عدم استحکام نہیں بلکہ یہ ہے کہ خود شارع نے سونے اور چاندی کو معیار بنایا ہے۔ کاغذی نوٹ نہ شارع۔ علیہ السلام کے دور میں موجود تھا اور نہ فقہاء مجتہدین کے دور میں کہ اس کی بے ثباتی اور ناقابل اعتبار ہونے کا معاملہ زیر بحث آتا۔ زکوۃ کے معیار نہ ہونے سے کس طرح یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ فقہائے امت ان نوٹوں کو بطور ثمن یا کرنسی ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔

صاحب مقالہ کا مذکورہ استدلال بالکل اسی طرح کا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فقہاء نے مسافت قصر کیلئے اونٹ کے ذریعہ سفر کو اسی لئے معیار بنایا ہے کہ جہاز اور ریل آئے دن کے حادثات کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہو چکے ہیں۔

مقالہ نگار کی یہ بات کہ کاغذی نوٹ زر کی خصوصیات کھو چکے ہیں اور وہ اپنی قدر کی بے ثباتی کی بنیاد پر اشیاء کو ناپنے کا معیار نہیں بلکہ اشیاء ان نوٹوں کیلئے معیار بن گئی ہیں' سابقہ دلیل کی طرح اپنے اندر زیادہ وزن نہیں رکھتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ کاغذی نوٹ ایک متعین ظاہری قیمت (Face Value) رکھتے ہیں۔ ان کی یہ متعین ظاہری قیمت اسی وقت تبدیل ہوتی ہے جب اسے جاری کرنے والی اتھارٹی خود تبدیل کر دے۔ پانچ سو کے نوٹ کو جب تک حکومت پانچ سو کا نوٹ کہتی ہے اس وقت تک وہ پانچ سو کا نوٹ ہی کہلائے گا۔ اسے چار سو کا نوٹ نہیں سمجھا جا سکتا۔ افراط زر کی صورت حال میں فرق صرف اتنا پڑتا ہے کہ اس پانچ سو کے نوٹ سے اشیاء کی

نسبتاً کم مقدار خریدی جا سکتی ہے۔ کسی چیز کی قدر میں کسی وجہ سے اگر اضافہ ہو جائے تو اس کو خریدنے کیلئے زیادہ نوٹ درکار ہونگے جو اس کی بڑھی ہوئی قدر کو ظاہر کر رہے ہوں گے۔ اسے روپے کی قیمت میں کمی نہیں بلکہ قیمتوں میں اضافہ کہا جائے گا۔ کیونکہ روپے کی قیمت متعین ہے۔

صاحب مقالہ جس درہم و دینار (سونا و چاندی) کا مقدمہ زور و شور سے پیش کر رہے ہیں اپنے نتائج کے اعتبار سے وہ بھی تو کاغذی نوٹوں ہی کی طرح ہیں۔ اگر سونے کے سکہ۔ دینار کو معیار بنا لیا جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس سے ہر دور میں اشیاء کی ایک ہی جیسی مقدار خریدی جا سکے گی۔ ممکن ہے ایک وقت میں اس مقدار کیلئے ایک دینار درکار ہو اور دوسرے وقت میں اسی مقدار کیلئے دو دیناروں کی ضرورت پڑے۔ بلکہ اگر اشاریہ بندی مطلوب ہی ہے تو پہلے سونے و چاندی کی اشاریہ بندی کسی مستحکم قیمت والی چیز سے کی جائے کیونکہ ان کی قیمتیں کئی اشیاء کے مقابلہ میں مسلسل روبہ تنزل ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کی دیت سو اونٹ مقرر کی تھی۔ سونے و چاندی میں یہی دیت بالترتیب ایک ہزار دینار اور دس ہزار درہم تھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سو اونٹ' دس ہزار درہم اور ایک ہزار دینار اپنی قیمت و مالیت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر تھے۔ آج کل ہمارے ملک میں دیت کی مقدار' جس کا مدار چاندی ہے' روپوں میں ایک لاکھ ستر ہزار کے قریب ہے جب کہ سو اونٹوں کی قیمت دس لاکھ سے بیس لاکھ کے درمیان ہے۔ اس طرح سو اونٹوں کے مقابلہ میں دس ہزار درہم چاندی کی قیمت محض ۱/۵ یا ۱/۱۰ رہ گئی ہے۔ جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ دونوں تقریباً برابر تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی اشیاء کے مقابلہ میں خود سونے و چاندی کی قدر بھی کم ہوتی رہتی ہے۔

جہاں تک اشیاء کی گرانی اور افراط زر کا تعلق ہے تو اس سے کسی بھی دور کی معیشت کبھی محفوظ نہیں رہی۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اشیاء مہنگی ہو گئی تھیں جس پر لوگوں نے آپؐ سے قیمتوں کے تعین کی درخواست کی۔ لیکن آپ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط و انی لا رجو ان القی اللہ ولیس احد یطلبنی بمظلمۃ فی مال ولا دم۔ (۱۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فطری معاشی عمل سمجھتے تھے۔ علامہ ابن قیمؒ عہد نبوی میں واقع ہونے والی اس گرانی کو چیزوں کی قلت اور طلب کی زیادتی کا سبب قرار دیتے ہیں (۱۴) جو ایک فطری معاشی عمل ہے۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ یہ واقعہ درہم و دینار کے نظام زر میں پیش آیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ درہم و دینار قیمتوں کے استحکام کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔ بالفاظ دیگر ان سے افراط زر کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی مسلم ہے کہ مذکورہ مہنگائی سے قرضخواہوں کے سرمایہ اور ان کی قوت خرید کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ تاہم ہمیں نصوص سے کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی کہ مقروضوں کو کہا گیا ہو کہ وہ قرضوں کی واپسی میں طے شدہ مقدار کی بجائے قدر (Value) یا قوت خرید واپس کریں۔ اگر آپؐ غیر مستحکم قیمتوں یا افراط زر کی حالت میں طے شدہ مقدار کی ادائیگی کو ظلم سمجھتے تو اس مسئلہ کو موجودہ دور کے "محققین" کے "اجتہاد" پر چھوڑنے کی بجائے خود ہی شارع کی حیثیت سے حل کر دیتے اور اگلی نسلوں کیلئے نہ چھوڑتے۔

کیا علت ربا ظلم ہے۔

مقالہ نگار نے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کے حوالہ سے یہ بات لکھی ہے کہ حرمت ربا کی علت ظلم ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے لکھا ہے کہ ابن رشد نے بھی ایسی ہی بات لکھی ہے۔

ربا کے حوالے سے مقالہ نگار نے جو بات کہی ہے اس کا سہارا عام طور پر وہ حلقہ لیتے ہیں جو بینک کے سود کو جائز و حلال دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ حرمت سود کی علت اگر ظلم و ناانصافی ہوتی تو پھر تو تجارتی قرضوں کا سود جائز و حلال ہونا چاہئے تھا' کیونکہ مقروض کارخانے دار بڑی آسانی سے اپنے قرضوں پر سود ادا کرتا ہے اور اسے اپنے ساتھ کوئی ظلم و ناانصافی تصور نہیں کرتا۔

ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے بھی ظلم کو حرمت ربا کی علت نہیں قرار دیا' البتہ حکمت کے طور پر ضرور اس کا ذکر کیا ہے۔ صاحب مقالہ نے اس مقام پر علت و حکمت کو خلط ملط کر دیا ہے۔ علماء اصول نے علت کی تعریف یہ کی ہے:

"ھو الوصف الظاھر المنضبط الذی یبنی علیہ الحکم و ربط بہ و جودا و عدما"

"یہ (اصل کی) ایک ظاہر و منضبط یعنی معین و غیر متبدل صفت ہے جس پر حکم کا دار و مدار ہوتا ہے"۔ (۱۵)

حکمت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"ھی المصلحۃ التی قصد الشارع تحقیقھا بتشریع الحکم"

یہ وہ مصلحت و مفاد ہے جو کوئی حکم وضع کرتے ہوئے شارع کے پیش نظر ہوتا ہے" (۱۶)

حکمت گو کہ شرعی احکام کی روح اور بنیاد ہوتی ہے مگر مخفی، غیر معین، تغیر پذیر اور ناقابل گرفت ہونے کی وجہ سے مدار احکام نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر علماء اصول کا متفقہ فیصلہ ہے کہ:

"الاحکام تبنی بعللھا دون حکمھا"۔

"احکام کا دار و مدار علت پر ہوتا ہے کہ نہ کہ حکمتوں پر" (۱۷)

علت و حکمت کی اس تشریح کی روشنی میں اگر ہم ربا کی علت کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ربا الدیون میں اس کی علت اصل زر پر وہ مشروط اضافہ ہے جو مدت کے مقابلہ میں مقروض سے لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی معاملہ قرض میں اگر مشروط اضافہ پایا جائے گا تو اسے سودی معاملہ کہا جائے گا، قطع نظر اس کے کہ ظلم واقع ہوا ہے یا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عام طور پر اس طرح کے معاملہ میں مقروض کے ساتھ ظلم و ناانصافی واقع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی فرماتے ہیں کہ ربا میں علت سے مراد وہ قاعدہ ہے کہ جس سے وقوع ربا کا تعین ہوتا ہے (۱۸) (اور وہ اصل زر پر مشروط اضافہ ہے)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں علت کے الفاظ فنی و اصطلاحی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے بلکہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں علت حکمت و مقصد کے معنوں میں وارد ہوا ہے۔

صاحب مقالہ نے اپنے موقف کی تائید میں ابن رشد کا بھی حوالہ دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن رشد کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے اسی میں کہیں بھی حرمت سود کیلئے ظلم کو علت قرار نہیں دیا گیا۔ "بدایۃ المجتھد" کی متعلقہ عبارت یہ ہے:"

"ولکن اذا تؤمل الامر من طریق المعنی ظھر ((واللہ اعلم)) ان علتھم اُولی العلل،

وذلک انہ یظھر من الشرع ان المقصود بتحریم الربا انما ھو لمکان الغبن الکثیر الذی فیہ' وان العدل فی المعاملات انما ھو مقاربۃ اتساوی"۔

"اگر معاملے کا اس کے مقصود کے حوالہ سے جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی (یعنی احناف کی) بیان کردہ علت سب سے مناسب ہے' کیونکہ تحریم ربا کی وجہ اس معاملہ میں (یعنی ہم جنس اشیاء کے اضافے کے ساتھ تبادلہ میں) دھوکہ و ناانصافی کا ہونا ہے اور معاملات میں عدل و انصاف ممکنہ حد تک برابری ومساوات سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں"۔ (۱۹)

یہ ساری گفتگو دراصل حرمت ربا الفضل اور ربا النسیئہ کی علت کے سیاق میں آئی ہے ابن رشد نے اموال ربویہ میں حرمت کی مختلف علتیں فقہاء کے حوالے سے نقل کی ہیں اور پھر احناف کی بیان کردہ علت ربا اتحاد جنس و مقدار کو سب سے راجح قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قصد شارع یا حکمت حکم کے زیادہ قریب ہے۔

اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے ربا میں علت ظلم کو قرار دیا ہے' بلکہ مختلف علتوں کے ذکر کے بعد یہ الفاظ کہ "عدل مقصود شارع ہے" اسی بات کا ثبوت ہیں کہ اتحاد جنس مقدار ان کے ہاں علت ہے اور دھوکہ و ناانصافی حکمت۔ علت و حکمت کا فرق ابن رشد جیسے مجتہد و فقیہہ سے کیسے پوشیدہ ہو سکتا ہے۔

عددی مثلیت اور قدر

شاہ صاحب کا خیال ہے کہ کاغذی زر کی قدر کی بے ثباتی اور عدم استحکام کے پیش نظر قرضوں اور موجل ادائیگیوں میں عددی مثلیت کا شرعی طریقہ کار نظرثانی کا مستحق ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "کیا موجل ادائیگیوں میں حقیقی زر کی طرح اس میں بھی بہرحال عددی مثلیت کا لحاظ رکھا جائے گا یا ان میں حقیقی قدر ملحوظ رکھی جائے گی۔ یہ مسئلہ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اور آج غیر سودی نظام کے اجراء کی جو کاوشیں ہو رہی ہیں' ان کے ضمن میں اسی مسئلہ کا شافی حل ملت اسلامیہ کے اہل علم افراد کی ترجیحی ذمہ داری ہے"۔

شاہ صاحب جس مسئلہ پر ابتدائے مقالہ میں اہل علم کو اجتہاد کی محض دعوت دیتے نظر آتے ہیں' اسی مسئلہ پر بعد کے چند صفحات میں خود زمام اجتہاد سنبھالے ہوئے نظر آتے ہیں وہ اپنا

اجتہادی فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں: "اشاریہ کی اسکیم اس لئے وضع کی گئی ہے کہ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو سکے اور موجل ادائیگیوں میں بھی ایفائے عقود کی اسلامی تعلیمات کو روبہ عمل لایا جا سکے۔ اگر زرکاغذی کی قوت خرید میں واقع ہونے والی کمی کا ازالہ نہ کیا جائے تو یہ شرعی نصوص کی خلاف ورزی ہوگی"۔ وہ مزید فرماتے ہیں: "اشاریہ کی جو اسکیم تجویز کی گئی ہے اس کی مختلف صورتوں میں اضافہ ظاہری ہے۔ اس بنا پر علت ربا (ظلم) کا اطلاق اس پر ممکن نہیں۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ اسکیم اصل میں ازالہ ظلم و ضرر کیلئے وضع کی گئی ہے"۔

اس موخر الذکر عبارت میں انہوں نے یہ حتمی فیصلہ سنا دیا ہے کہ قرض کی ادائیگی کرتے وقت عددی مثلیت کا لحاظ ضروری نہیں بلکہ مقروض دائن کو قرض کی قدر (Value) ادا کرے۔

اشاریہ بندی کے محاسن و مفاسد پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اموال ربویہ کے تبادلہ اور قرض کے بارے میں شرعی احکام کا جائزہ لیا جائے۔

فقہاء معاہدہ قرض کی درج ذیل تعریف کرتے ہیں:

"هو ماتعطيه من مال مثلي لتتقاضاه" (۴۰)

"یہ وہ مال مثلی ہے جو آپ کسی کو دیتے ہیں تاکہ وہ اسی سے وصول کریں"

"یہ مال مثلی کا کسی کو مالک بنانا ہے تاکہ وہ اس کا مثل واپس کرے"۔ (۴۱)

احناف کے نزدیک قرض صرف مثلی اشیاء میں جاری ہوتا ہے۔ یعنی ایسی اشیاء میں جن کی اکائیاں یا افراد ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔ یہ وہ اشیاء ہیں جن کی خرید و فروخت عام طور پر کیل، وزن اور گنتی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مثلی اشیاء میں ان کا مثل واپس کیا جائے گا۔ ابن قدامہ فرماتے ہیں: "قال ابن المنذر: "اجمع كل من نحفظ عنه من أهل العلم على ان من اسلف سلفا مما يجوز ان يسلف فرد عليه مثله ان ذلك جائز و أن للمسلف اخذ ذلك و لان المكيل والموزون يضمن فى الغصب و الاتلاف بمثله فكذا ههنا"۔

"ابن منذر نے کہا: تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ کسی نے دوسرے کو اگر کوئی قابل قرض چیز دی تو وہ اس کا مثل واپس کرے اور ایسا کرنا درست ہوگا اور قرض خواہ کو یہ قبول

کرنا ہوگا کیونکہ کیل و وزن والی اشیاء کے غصب و اتلاف کی صورت میں تاوان میں ان کا مثل ہی ادا کیا جاتا ہے' اسی طرح یہاں بھی ایسا ہوگا"۔ (۲۲)

اسی رائے کا اظہار فقہاء شافعیہ نے بھی کیا ہے (۲۳) ابن قدامہ کی رائے میں مقدار قرض کا تعین ضروری ہے۔ اسی کا تعین تولی جانے والی اشیاء میں تول اور گنی جانے والی اشیاء میں گن کر ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں۔ "اگر کسی نے غیر معین وزن کے درہم و دینار ادھار لئے تو یہ ادھار درست نہ ہوگا۔ اسی طرح کوئی اور ناپی اور تولی جانے والی چیز اندازے سے قرض لی تو یہ درست نہ ہوگا۔ اگر درہموں کا لین دین لوگ گنتی کے ذریعہ کرتے ہیں اور اس نے بھی قرض میں گن کر درہم لئے تو اسے گن کر ہی واپس کرنے ہونگے۔ اور اگر تول کر لئے ہیں تو تول کر ہی واپس کرنے ہونگے" (۲۴)

اسی طرح ابن قدامہ نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ادائیگی قرض میں مثلیت جہاں جنس میں ہوگی وہاں مقدار میں بھی ہوگی ۔ اور مقدار کی یہ مثلیت اسی صورت میں متحقق ہوگی ہے جب وزن' کیل اور گنتی میں مماثلت اور برابری کا لحاظ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء احناف نے اموال ربویہ کے تبادلہ میں جنس و مقدار کی وحدت کی شرط عائد کی ہے (۲۵) ان کا موقف یہ ہے کہ حدیث میں وارد مثلاً بمثل (۲۶) کا تقاضا اسی صورت میں پورا ہوگا جب پانچ من گندم کے بدلے میں پانچ من گندم دی جائے۔ حنبلی فقہاء کا بھی یہی موقف ہے۔ (۲۷) دیگر فقہاء کے ہاں اموال ربویہ کی علتوں میں تو اختلاف ہے کہ ان کی علت ثمنیت ہے' کھانے پینے کی اشیاء ہونا ہے' یا ذخیرہ کئے جانے کی صفت ہے' لیکن اس بات پر وہ بھی متفق ہیں ان اشیاء کے باہمی تبادلہ میں' چاہے وہ بیع ہو یا قرض' یکساں مقدار کا ضرور لحاظ رکھا جائے گا۔

فقہاء کے ہاں اس مسئلہ میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ "مثلیت" سے مراد ناپ' وزن' عدد اور مقدار میں مساوات و برابری ہے۔ ان کے اقوال میں کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ اس سے مراد قیمت و قدر (value) کی برابری بھی ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں حدیث کے الفاظ بالکل واضح ہیں: "الجید والردی فیہ سواء" کہ ان اشیاء کے تبادلہ میں ان کی صنعت و نوعیت کا بالکل خیال نہیں رکھا جائے گا یعنی بڑھیا و گھٹیا دونوں کا تبادلہ وزن و کیل کی برابری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۵۰۰ روپے کے بدلے میں ۵۰۰ روپے ہی دیئے

جائیں گے چاہے واپسی قرض کے وقت ان کی صفت (Quality) بدل جائے یعنی ان کی قدر میں کمی واقع ہو جائے' کیونکہ اسی طرح "الجید والردی فیہ سواء" کا تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔

مولانا تقی عثمانی فرماتے ہیں: "قرآن و سنت کے دلائل میں غور کرنے اور لوگوں کے معاملات کا مشاہدہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کی واپسی میں جو برابری شریعت میں مطلوب ہے وہ مقدار و کمیت میں مطلوب ہے' قیمت و مالیت میں مطلوب نہیں" (۲۸)

فقہاء کا اس مسئلہ پر بھی اجماع ہے کہ اگر قرض کی واپسی کے وقت مال قرض کی قیمت میں کمی بیشی واقع ہو گئی تب بھی مقروض وہی مقدار واپس کرے گا جو اس نے قرض میں لی تھی۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں:"

"المستقرض یرد المثل فی المثلیات' سواء رخص سعرہ اوغلا' او کان بحالہ" مدین مثلیات میں مثل لوٹائے گا چاہے اس کی قیمت کم ہو جائے یا زیادہ یا سابقہ قیمت برقرار رہے"۔ (۲۹)

ابن عابدین لکھتے ہیں:

واجمعوا ان الفلوس اذا لم تکسد ولکن غلت قیمتها او رخصت فعلیہ مثل ما قبض من العدد"

" فقہاء اس بارے میں متفق ہیں کہ سکوں کی قیمت متروک ہوئے بغیر گھٹ یا بڑھ جائے تو مقروض کو وہی تعداد لوٹانی ہوگی جو اس نے قرض لی تھی" (۳۰)

عبدالرحمن الجزیری لکھتے ہیں:

"قرض کے من جملہ مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں لین دین برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر پیمانے والے کوئی شے قرض دی گئی مثلاً گندم' تو یہ لازم ہوگا کہ جو شے لی ہے وہ اسی قدر واپس کی جائے' قطع نظر اس کے کہ وہ سستی ہو یا مہنگی۔ یہی حکم ان اشیاء کا ہے جن کا سودا گنتی سے یا وزن سے کیا جاتا ہے" (۳۱)

اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ بعنوان "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ" ۱۹۸۰ء میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے الفاظ میں: "جہاں تک کوئی چیز ادھار دینے اور لینے کا

تعلق ہے شریعت کے مطابق نقدی کی صورت میں لین دین اور جنس کی صورت میں لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی شے کی جو مقدار ادھار لی گئی ہے وہی مقدار واپس کی جائے گی' خواہ اس عرصہ میں اس کی قیمت میں کتنا ہی تغیر واقع ہو چکا ہو۔ مثلاً اگر ایک من گندم ادھار لی گئی تو قرض دار کو گندم کی اتنی ہی مقدار واپس کرنی ہوگی خواہ اس کی قیمت تیس روپے سے بڑھ کر پچاس روپے من ہو گئی ہو یا گھٹ کر پندرہ روپے من رہ گئی ہو۔ اسی طرح اگر نقدی کی کوئی خاص مقدار قرض لی گئی ہو مثلاً ایک ہزار روپے تو قرضدار کو ایک ہزار روپیہ ہی واپس کرنا ہوگا خواہ اس عرصہ میں دوسری اجناس اور خدمات کی نسبت سے روپے کی قیمت میں کتنی ہی تبدیلی آ چکی ہو" (۳۲)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شریعت میں احکام علتوں کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں کیونکہ وہ واضح' معین' منضبط اور قابل گرفت ہوتی ہیں ۔ کیل' وزن اور مقدار ایک معین و منضبط چیز ہے جبکہ قدر (Value) ایک مخفی' غیر معین اور تغیر پذیر چیز ہے۔ قدر چیزوں کے حوالے سے بدلتی رہتی ہے۔ ۱۰ من گندم کی قدر سونے کے حوالے سے ایک ہوگی اور نمک اور جو کے حوالہ سے دوسری۔ یہ ایک اضافی (Relative) اصطلاح ہے۔ اس طرح کی مخفی' مبہم اور غیر معین صفت کو شریعت میں مدار احکام نہیں بنایا جا سکتا۔

صاحب مقالہ نے اپنے اس موقف کے حق میں کہ کاغذی نوٹوں کے باہمی تبادلہ یا قرض میں عددی مثلیت ضروری نہیں' یہ دلیل پیش کی ہے کہ علماء نے دو مختلف ممالک کے نوٹوں کی خرید و فروخت میں تفاضل کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ وہ دونوں شکل و صورت حجم اور نام میں یکساں ہوں۔

یہاں انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس جواز کی بنیاد ان کا کاغذی نوٹ ہوتا ہے ورنہ اگر وہ درہم و دینار ہوتے تو یہ تفاضل ربوا ہوتا۔ وہ یہ حقیقت نظرانداز کر گئے ہیں کہ دو ممالک کے نوٹ ہم جنس کرنسی نہیں بلکہ دو الگ الگ کرنسیوں کی حیثیت رکھتے ہیں خواہ ان کے نام حجم اور شکل یکساں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم برطانوی پونڈ اور مصری پونڈ کو ایک نہیں کہہ سکتے' اسی طرح ہندوستانی اور پاکستانی روپے کو ایک جنس نہیں قرار دے سکتے۔ اب اگر یہ دو مختلف اجناس ہیں تو ان کا تفاضل کے ساتھ تبادلہ تو حدیث سے ثابت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

"فاذا اختلفت هذه الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یدا بید" (۳۳) (اگر ان اشیاء کی جنس مختلف ہو تو پھر ان کا تبادلہ جیسے چاہے کرو بشرطیکہ اس میں فوری قبضہ ہو)۔

اشاریہ بندی اور شرعی نقطۂ نظر

صاحب مقالہ نے اشاریہ بندی کی توصیف میں خاصی محنت کی ہے۔ انہوں نے دعوی کیا ہے کہ: "اشاریہ بندی کی اسکیم حقداروں کے حق کا تحفظ کرتی ہے"، "اس کا مقصد ازالہ ظلم و ضرر ہے"، "یہ مقتضائے شرع کے عین مطابق ہے"، "اور یہ فقہاء کے اجتہادات سے متصادم بھی نہیں ہے"۔

قرضوں کی اشاریہ بندی کا شرعی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اشاریہ بندی کی اس اسکیم کا مختصراً تعارف کرا دیا جائے جس کی طرف صاحب مقالہ نے بار بار اشارہ کیا ہے۔

ماہرین معیشت کہتے ہیں کہ کرنسی کی ایک مخصوص مقدار کی حقیقی قیمت اشیاء اور خدمات کا وہ مجموعہ ہے جو اس کرنسی سے خریدا جا سکتا ہو۔ یہ مجموعہ صارف کی اشیاء کی ٹوکری (Basket of Consumer's goods) کہلاتا ہے۔ اس میں روز مرہ کی اشیاء کی کوئی تیس چالیس اشیاء شامل ہوتی ہیں ۔ اشاریہ کیلئے ٹوکری میں شامل مختلف اشیاء کی قیمتوں کے اوسط کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ان اشیاء کے علیحدہ علیحدہ خاص وزن مقرر کئے جاتے ہیں جس کی بنیاد متعلقہ چیز کی صرفی اہمیت ہوتی ہے۔ پھر ہر چیز کی قیمت میں اوسط تبدیلی کو اس کے مخصوص وزن سے ضرب دی جاتی ہے جس سے اس چیز کا اوسط وزن نکل آتا ہے۔ پھر ان تمام کا مجموعی اوسط نکالا جاتا ہے جو قیمتوں کے اتار چڑھاو کی سطح کا اشاریہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر صارف کی اشیاء کی ٹوکری (یعنی اس میں شامل اشیاء) ۱۹۹۰ء میں سو روپے میں خریدی جا سکتی تھی اور ۱۹۹۵ء میں وہی ٹوکری دو سو پچاس روپے میں خریدی جا سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کرنسی کی قوت خرید میں ۲۵ % کی نسبت سے کمی واقع ہوئی ہے۔ انڈیکسیشن کا طریقہ کار اور انتخاب مختلف ملکوں میں مختلف ہے، تاہم اشیاء کا قیمتوں سے ربط اشاریہ بندی کی سب سے عام ترکیب ہے۔

اس اسکیم کو اگر ہم قرضوں پر منطبق کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقروض دائن کو راس المال کے علاوہ مزید ۲۵% بھی ادا کرے گا کیونکہ اسی طرح دائن کے سرمایہ کو پہنچنے والے خسارے کی تلافی ہو سکے گی۔ راس المال پر یہ اضافی رقم سود نہیں بلکہ دائن کے نقصان کی تلافی کہلائے گی۔ اس نقصان کا تعین قیمتوں کا اشاریہ کرتا ہے۔

شرعی نقطۂ نظر سے اگر ہم قرضوں کی اشاریہ بندی کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس اسکیم میں تین طرح کی شرعی قباحتیں اور مفاسد مضمر ہیں:

اولاً: اس میں غرر و جہالت (ابہام و غیر یقینیت) کا عنصر موجود ہے۔ یہ "غرر" و "جہل" معاہدہ قرض میں عوض کا مبہم و غیر واضح ہونا ہے۔ قرض کو مستقبل میں خوردہ اجناس کی اوسط قیمت سے وابستہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عقد قرض میں ایک عوض کو مجہول چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور مدین (مقروض) کو یہ علم نہیں ہے کہ اس نے معاہدہ قرض کے خاتمہ پر کیا واپس کرنا ہے۔ اس کی نظیر عقد بیع میں ثمن کا مجہول ہونا ہے۔

"حاشیہ ابن عابدین" میں آیا ہے: "ثمن کی مقدار کا تعین صحت بیع کی شرط ہے۔ اگر ثمن مجہول رہے، جیسے کوئی شخص کسی شے کی بازاری قدر کو اس کی ثمن بنا لے تو بیع باطل ہوگی"۔ (۳۴)

"فتح العزیز" میں آیا ہے: "کسی چیز کی ذمہ میں ثابت ہونے والی مقدار، چاہے وہ ثمن ہو یا بیع، اگر مجہول رہتی ہے، تو عقد باطل ہے"۔ (۳۵)

صاحب "منتہی الارادات" نے لکھا ہے: عقد معاوضہ میں عوض کا تعین اور اس کا وقت معاہدہ معلوم و معین ہونا صحت معاہدہ کی شرط ہے"۔ (۳۶)

یہ ساری نصوص ظاہر کرتی ہیں کہ عقد معاوضہ کی رو سے ایک فریق پر جس موجل عوض کی ادائیگی لازم آتی ہے، اس کا واضح اور متعین ہونا ضروری ہے۔ زیر بحث معاہدہ قرض میں مدین نے جو عوض دینا ہے، وہ وقت معاہدہ مجہول و غیر معین ہے کیونکہ اس کا تعین یعنی اس کی مقدار کا تعین اجناس کی اوسط قیمت (اشاریہ) کے ذریعہ مستقبل میں کیا جاتا ہے۔

ثانیاً: یہ ربا الفضل کا پہلو لئے ہوئے ہے کیونکہ یہ شریعت کا غیر متنازع فیہ اصول ہے

کہ قابل مبادلہ شے اس کی مثل کی صورت میں واپس کی جائیگی۔ یہ مثلیت جنس کے ساتھ ساتھ وزن و مقدار میں برابری کی شکل میں ہوگی۔ کاغذی نوٹ بھی' جو تمام علماء کے متفقہ فیصلہ کی' رو سے درہم و دینار کے مشابہہ ہیں' اس اصول کے تابع ہوں گے۔ اور ان کا مبادلہ چاہے صرف کی صورت میں ہو یا قرض کی صورت میں' مقدار میں برابری کی بنیاد پر ہوگا۔ مقدار کی اس مثلیت سے ذرا بھی انحراف ربا الفضل کے زمرے میں آئے گا۔

اس مسئلہ پر علماء امت کے اجماع کا ایک مظہر اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد کے زیر اہتمام انڈیکیشن کے موضوع پر منعقدہ سیمینار ۱۹۸۷ء کی ایک قرار داد ہے جس میں کہا گیا ہے:

"ربا اور قرض کی احادیث میں مذکور یکسانیت اور مساوات سے وزن' پیمائش اور مقدار کی مساوات مراد ہے' مالیت کی برابری مراد نہیں۔ یہ بات متعلقہ احادیث سے بھی ظاہر ہے جن میں اموال ربویہ کے لین دین میں ان کی قدر (Value) کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ اس نکتہ پر امت کا اجماع ہے اور اس پر اسی طرح عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔" (۳۷)

پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت نے بھی قرضوں کی اشاریہ بندی کو خلاف شرع قرار دیا ہے۔ (۳۸)

ثالثاً: یہ کسی کا مال ناحق طریقہ سے کھانے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس میں مقروض کے ساتھ واضح ظلم و ناانصافی تجویز کی گئی ہے۔ اسکیم میں مضمر ظلم و ناانصافی اور "اکل اموال الناس بالباطل" کے عنصر کو درج ذیل حقائق سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اشاریہ بندی کی اسکیم کے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ یہ دائن کے اس نقصان کی تلافی کا طریقہ کار ہے جو اس کے سرمایہ کی قوت خرید کو عرصہ قرض کے دوران لینا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نقصان کی ذمہ داری مقروض پر کیوں ڈالی جائے جبکہ افراط زر اس کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ کمی تو اس صورت میں بھی واقع ہوتی ہے جب یہ سرمایہ گھر پر رکھا یا جیب میں پڑا ہوتا ہے۔

جدید معیشت میں افراط زر بہت سے عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور عملاً اس

کا تعین مشکل ہوتا ہے کہ افراط زر پیدا کرنے میں کس عامل کا کتنا حصہ ہے۔ افراط زر کا ایک بڑا روایتی سبب طلب و رسد کے درمیان عدم توازن ہے۔ رسد کے مقابلہ میں اشیاء کی طلب اگر بڑھ جائے تو افراط زر پیدا ہوتا ہے۔ اشیاء کی طلب آبادی میں اضافہ' شہروں کی طرف تیزی سے انتقال آبادی جیسے اسباب سے بڑھتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف اشیاء کی رسد اس بڑھی ہوئی ضرورت کی تکمیل کیلئے ناکافی ہوتی ہے' چنانچہ قیمتیں بڑھتی ہیں اور افراط زر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ چند چیزوں کا تعاقب سرمایہ کی بڑی مقدار کر رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح اشیاء کی پیداواری لاگت بڑھنے سے بھی افراط زر وجود میں آتا ہے۔ اشیاء کی پیداواری لاگت میں اضافہ کئی اسباب کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ خام مال اور مشینری کی قیمتوں ' بجلی گیس وغیرہ کے اخراجات' ٹیکسوں مزدوروں کی تنخواہوں اور اجرتوں میں اضافہ' عام طور پر وہ اسباب ہوتے ہیں جنکی بنا پر تیار شدہ چیز کی قیمت بڑھتی ہے اور افراط زر کا سبب بنتی ہے۔ بعض اوقات حکومت کو کئی اہم قومی ضروریات کی تکمیل کیلئے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے' جبکہ اس کی آمدن اور محاصل ان اخراجات کو پورا کرنے کیلئے ناکافی ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں اسے نئے کرنسی نوٹ چھاپنے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ چیز افراط زر کا باعث بنتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پیچ در پیچ عوامل مشترکہ طور پر کسی معیشت میں افراط زر کی کیفیت کو جنم دیتے ہیں۔ اب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ افراط زر کی وجہ سے سرمایہ کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کا مطالبہ مدین سے کیا جائے۔ کیا یہ بینک سے قرض لینے والے کارخانہ دار کو دہری سزا دینے کے مترادف نہیں کہ ایک طرف تو وہ مزدور کی تنخواہ کو انڈکس کر کے اسے زیادہ تنخواہ ادا کرے دوسری طرف بینک کے قرض کو انڈکس کر کے اسے قرض کی بھاری رقم ادا کرے جس میں اصل زر کے علاوہ خسارے کی تلافی والی مقدار بھی شامل ہو۔

۲۔ صارف کی اشیاء کی ٹوکری (Basket of Cousumer,s Goods) سرمایہ کی قوت خرید جانچنے کا ایک نامنصفانہ معیار ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے' بھاری اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اسی بات کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے ہمارے ملک کی ستر فیصد آبادی دیہات میں آباد ہے۔ ان کی اکثریت اس ٹوکری کی اشیاء جیسے چھوٹا گوشت' ڈبل روٹی' انڈے' نیڈو ملک پوڈر' ٹوتھ پیسٹ وغیرہ استعمال ہی نہیں کرتی۔ ان لوگوں کی صرفی ٹوکری تو

بالعموم آٹا' دالوں اور گھی وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ شہروں میں بھی تمام لوگ مجوزہ ٹوکری کی تمام اشیاء نہیں استعمال کرتے۔ لہٰذا اگر قرضوں کی ادائیگی کیلئے اسے معیار بنایا گیا تو یہ بقول ڈاکٹر حسن الزمان "کچھ لوگوں کیلئے ظلم اور کچھ لوگوں کیلئے ایک ناجائز رعایت بن جائے گا" (۳۹)

اگر قرضوں کو اشیاء کی ٹوکری کے مطابق انڈکس کیا جائے تو کئی افراد کیلئے یہ نامنصفانہ معیار ہوگا کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ جو اشیاء ایک فرد استعمال کر رہا ہے۔ ان کی قیمتیں حکومتی ٹوکری یعنی صارف کی اشیاء کی ٹوکری" کے مقابلہ میں کم بڑھی ہوں۔ اس صورت میں اگر وہ اوسط ٹوکری کی قیمتوں کے مطابق قرض کی ادائیگی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قدر کو پہنچنے والے حقیقی نقصان کے مقابلہ میں وہ زیادہ رقم ادا کر رہا ہے۔ یہ اس کے ساتھ ظلم و ناانصافی ہوگی۔

۳۔ قیمتوں کا اشاریہ قیمتوں میں تبدیلی جانچنے کا کوئی قابل اعتماد معیار نہیں۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ قیمتوں میں تغیر و تبدیلی فی الواقع اسی سطح پر ہوئی ہے جس کا تعین اشاریہ میں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاریہ اپنی تیاری کے تمام مراحل میں اندازے اور تخمینے پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک چیز کی قیمت بعض اوقات مختلف شہروں اور جگہوں پر مختلف ہوتی ہے۔ لیکن اشاریہ میں ایک درمیانی اوسط نکالا جاتا ہے جو یقیناً ایک اندازے ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اشیاء کو دئے جانے والے اوزان میں بھی انداز سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ فلاں چیز صارفین کیلئے دوسری کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔

بعض اوقات حکومت یہ اشاریہ اپنے مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر بناتی ہے۔ اشاریہ میں اشیاء کے اندراج انہیں دئے جانے والے مخصوص اوزان میں اپنے مفاد کا خیال رکھتی ہے وہ اشاریہ میں ایسی چیزیں شامل کر سکتی ہے جن کی قیمتیں زیادہ نہ بڑھی ہوں تاکہ قیمتوں میں استحکام کا تاثر دیا جائے جبکہ عملاً باسکٹ سے باہر کی اشیاء کی قیمتیں بڑھ رہی ہونگی۔ اس طرح اشاریہ سرمایہ کی حقیقی قدر جانچنے کا ایک ناقابل اعتبار معیار ہوگا۔ ایسے ناقابل اعتبار اور غیرمنصفانہ پیمانے سے قرضوں کی ادائیگی کس طرح منصفانہ اور مقتضائے شرع کے مطابق ہو سکتی ہے۔

۴۔ اشاریہ بندی نامنصفانہ ہونے کے ساتھ ساتھ غیر عملی بھی ہے اشاریہ کسی خاص تاریخ کو قیمتوں کی بنیاد پر یا کسی خاص مدت کے دوران اوسط قیمت کی بنیاد پر سال بھر میں ایک بار'

دوبار' یا تین بار بنایا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس بچت' ادھار اور ان کی ادائیگی روزمرہ کا کام ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس عرصہ میں کوئی اشاریہ موجود نہ ہو اس میں قرض کی ادائیگی کس طرح کی جائے گی۔ کیا یہ اندازے سے ہوگی یا پچھلے اشاریہ کی بنیاد پر۔

انڈیکیشن کی یہی قباحتیں ہیں جن کی بنا پر علماء اور مسلم ماہرین معیشت نے بالاتفاق قرضوں کی اشاریہ بندی کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیا ہے۔ (۴۰)

فلوس میں امام ابو یوسف کی رائے۔

صاحب مقالہ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فلوس کے "رخص وغلا" (ارزانی و مہنگائی) کی صورت میں مقروض دائن کو فلوس کی قدر (Value) ادا کرنے کا پابند ہے یعنی وہ اسے فلوس کی وہ قیمت ادا کرے جو قرض کے قبضے کے وقت تھی۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ احناف کے ہاں زر کی قدر وقتی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ "رخص وغلاء" کے حالات میں قیمت (Value) کی ادائیگی ہی قرین عدل و انصاف ہے۔

فلوس کی قیمت میں اتار چڑھاؤ اور اس کے موجل ادائیگیوں پر اثرات کے حوالہ سے امام ابو یوسف کے اصل موقف کا جائزہ لینے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ فقہاء کے ہاں فلوس کی بطور ثمن یا کرنسی حیثیت کیا ہے تاکہ کاغذی نوٹوں کو ان پر قیاس کیا جا سکے۔

عربی میں فلوس ایک بڑے سکے کی ریزگاری (Petty Coins) یا چھوٹے چھوٹے اجزاء کو کہا جاتا ہے جیسے روپے کے پیسے۔ عربی میں " افلس الرجل" (آدمی مفلس ہوگیا) کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے نوٹوں کا مالک اب چھوٹے چھوٹے پیسوں والا ہوگیا ہے۔ یعنی دمڑی اور دھیلے کی سطح پر آگیا ہے۔ "مختار الصحاح" میں آیا ہے۔ " افلس الرجل مفلسا کانّما صارت دراھمہ فلوسا " "آدمی مفلس ہوگیا گویا اس کے دراہم فلوس میں تبدیل ہوگئے" (۴۱) ۔ امام شوکانی فرماتے ہیں:

"المفلس شرعاً من یزید دینہ علی موجودہ' مسمی مفلسا لانہ صار ذا فلوس بعد ان کان ذا دراھم"۔

"شرعی اصطلاح میں مفلس وہ ہے جس کے قرضے اس کے پاس موجود مال سے زیادہ

ہوں۔ اسے مفلس اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب وہ پیسوں پر آگیا ہے جبکہ پہلے وہ درہموں (روپوں) کا مالک تھا" (۴۲)

زمانہ قدیم میں فلوس اپنی اس بے وقعتی کے علاوہ قانونی زر ہونے کی صفت سے بھی محروم تھے۔ ان کی پشت پر کوئی قانونی ضمانت نہیں تھی۔ ان کی کوئی متعین قیمت بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان کے وزن میں یکسانیت بھی مفقود تھی۔ فلوس کا وزن ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ تھا ڈاکٹر حسن الزمان کی تحقیق کے مطابق یہ وزن عام طور پر چھ سے تیس گرام کے درمیان ہوتا تھا۔ بعض اوقات ایک صوبے کی مختلف شہروں میں الگ الگ وزن کے فلوس چلتے تھے۔

یوڈووچ نے اپنی کتاب "Partnership and Profit in Midieval Islam" میں تفصیل کے ساتھ ان اسباب کا جائزہ لیا ہے جن کی بنا پر فقہاء کے ہاں فلوس کی حیثیت بطور ثمن متنازع تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "فلوس محض علامتی سکے تھے۔ وہ درہم و دینار کی طرح کبھی بھی قانونی زر نہیں رہے۔ ان کی قیمت اور قبولیت ہر جگہ دوسری سے مختلف تھی۔ درہم و دینار کے برعکس ان کی ڈھلائی بہت مقامی سطحوں پر ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وزن، شکل اور حجم میں ان کے درمیان بہت بڑا تفاوت تھا"۔ (۴۳)

انہی حقائق کی بنا پر فقہاء کے ہاں فلوس کی ثمنیت کبھی مسلم نہیں رہی۔ اس کی ایک بڑی دلیل فلوس کو مشارکت و مضاربت کا راس المال بنانے میں ان کا اختلاف ہے۔ امام محمدؒ کے علاوہ باقی تمام فقہاء کے نزدیک فلوس مشارکت و مضاربت کا راس المال نہیں بن سکتے۔ حتی کہ امام ابو یوسف بھی اسے راس المال کے طور پر قبول نہیں کرتے۔ امام شافعی کے نزدیک فلوس ثمن نہیں خواہ وہ رائج ہی کیوں نہ ہوں۔ (۴۴)

عرف و عادت اور فقہی نصوص سے ملنے والے ان شواہد سے فلوس کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ یا تو اصلا کرنسی ہے ہی نہیں یا ایک ناقص کرنسی ہے۔ اس پس منظر میں کاغذی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کاغذی نوٹوں کی تو ایک واضح و متعین قیمت ہوتی ہے، ان کی پشت پر حکومت کی ضمانت بھی ہوتی ہے۔ وہ ملک کے ہر علاقے میں یکساں ثمن کے طور پر جاری و ساری ہوتے ہیں۔ کاغذی نوٹ علماء امت کے متعدد فیصلوں کی رو سے درہم و دینار کی مانند ہیں۔ لہذا انہیں اگر کسی کرنسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے تو وہ درہم و دینار ہیں

نہ کہ فلوس۔

اب ہم فلوس کے بارے میں امام ابو یوسف رحمتہ اللہ کے مسلک کی طرف آتے ہیں۔ امام ابو یوسف کا موقف یہ ہے کہ اگر فلوس کا مارکیٹ میں چلن موقوف ہو جائے تو ایسی صورت میں مشتری یا مدین ان کی بازاری قدر (Market Value) ادا کرے گا۔ لیکن اگر ان کا رواج تو ختم نہ ہو بلکہ صرف قیمت میں کمی بیشی واقع ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ اتنے ہی فلوس واپس کرے گا جو اس نے قرض لئے تھے۔ گویا فلوس کی قیمت میں کمی یا ان کی ارزانی کی صورت میں واجب الادا رقم کے بارے میں وہ جمہور کے موقف سے مکمل طور پر متفق ہیں۔ اس کی تصدیق امام کاسانی یوں کرتے ہیں۔ "..... ولو لم تکسد و لکنها رخصت قیمتها او غلت لا ینفسخ البیع بالاجماع وعلی المشتری ان ینقد مثلها عددا ولا یلتفت الی القیمة هنا لان الرخص او الغلاء لا یوجب بطلان الثمنیة الا تری ان الدراهم قد ترخص و قد تغلو وهی علی حالها اثمان"۔

اگر فلوس کا مارکیٹ میں رواج ختم ہوئے بغیر ان کی قیمت میں کمی یا زیادتی واقع ہو جائے تو ایسی صورت میں بالاتفاق بیع فسخ نہیں ہوگی اور مشتری کو (طے شدہ) فلوس گن کر دینے ہونگے اور قیمت و قدر (Value) کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ ارزانی و گرانی ثمنیت کو ختم نہیں کرتی ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ درہم کبھی ارزاں ہوتے ہیں کبھی گراں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ ثمن رہتے ہیں۔ (۴۵)

معلوم نہیں صاحب مقالہ نے یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا ہے کہ "امام ابو یوسف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجل مالی معاہدوں میں فلوس کے "رخص و غلاء" کا اعتبار ہوگا۔ چنانچہ اگر معاملہ قرض کا ہے تو قبضہ کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر خرید و فروخت کا معاملہ ہو تو معاہدے کے وقت کی قیمت معتبر سمجھی جائے گی"۔

امر واقع یہ ہے کہ جس واحد صورت میں امام ابو یوسف ؒ و امام محمد ؒ قدر کی ادائیگی کی اجازت دیتے ہیں وہ فلوس کے انقطاع یا رواج میں نہ رہنے کی صورت ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں مثل کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی۔ لہٰذا مذکورہ دونوں فقہاء کے نزدیک قیمت (Value) ادا کی جائیگی ۔ اب سوال یہ ہے کہ کس تاریخ سے قیمت کا تعین کیا جائے گا؟ اس کے جواب میں امام ابو یوسف یہ کہتے ہیں کہ اس کا تعین معاہدہ کے دن ان کی قیمت سے کیا جائے گا جبکہ امام محمد کے

نزدیک جس دن فلوس کا رواج ختم ہوا ہے' اس دن ان کی قیمت سے واجب الاوا قدر (Value) کا تعین ہوگا۔

خود صاحب مقالہ کے ہاں بھی ہمارے اس موقف کی تائید ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "امام ابو یوسف کے نزدیک اس نقطۂ نظر کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ فلوس کی ثمنی حیثیت محض لوگوں میں ان کی رواج پذیری کے باعث ہی ہوتی ہے۔ اب اگر لوگوں کا رواج ہی بدل جائے (یعنی لوگ انہیں ثمن کے طور پر استعمال کرنا چھوڑ دیں) یا ان کے رواج کی کیفیت میں تبدیلی آ جائے تو اصولاً اس تغیر کی رعایت کرنی چاہئے"۔

لیکن اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ فلوس کی گرانی و ارزانی کے سلسلہ میں امام ابو یوسف کا نقطۂ نظر وہی ہے جو صاحب مقالہ نے نقل کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ "احناف کے ہاں زر کی قدر وقتی کو تسلیم کیا گیا ہے اور فقہ حنفی کی رو سے عقد (یا قبضہ) اور ادائیگی کے مابین وقت میں قیمتوں کے اختلاف کا لحاظ ضروری ہے"۔ یہ صاحب مقالہ کی اپنے رائے یا خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن فقہ حنفی کا فیصلہ نہیں ہے۔ فقہ حنفی کا فیصلہ تو وہ ہے جو ابن عابدین نے نقل کیا ہے کہ: "تمام حنفی فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر فلوس کے رواج میں رہتے ہوئے ان کی قیمت بڑھ یا گھٹ جائے تو مدین نقود کی اتنی ہی مقدار واپس کرے گا جو اس نے لی تھی" (۴۶)

ابن عابدین کی مذکورہ عبارت میں "اجماع و اتفاق" کے الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ فلوس کے سلسلہ میں مفتی بہ مسلک وہ نہیں جو صاحب مقالہ نے نقل کیا ہے بلکہ وہ ہے جو ابن عابدین نے بیان کیا ہے۔

اسی موقف کا اظہار الشیخ عبدالقادر محمد حسب اللہ الحسینی الحنفی نے بھی اپنے رسالہ "تراجع سعر النقود بالامر السلطانی" (سرکاری حکم سے نقود کی قیمت میں کمی) میں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"قد تکرر فی زماننا ورود الامر السلطانی بتنقیص سعر بعض النقود الرائجة' فاذا کان عقد البیع او القرض وقع علی نوع معین منها کالریال الفرنجی مثلا فلا شبهة فی ان الواجب دفع مثل ماوقع علیه البیع او القرض"

ہمارے عہد میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ سرکاری حکم سے بعض مروج سکوں کی قیمت کم کر

دی جاتی ہے اگر اس طرح کسی خاص سکہ جیسے فرنچی ریال کی قیمت میں کمی واقع ہوئی ہو اور دو افراد نے اس خاص سکہ کی بنیاد پر بیع یا قرض کا معاہدہ کر رکھا ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتنے ہی سکے واپس کرے گا جتنے بیع یا قرض میں طے ہوئے تھے (یعنی ان کی قدر و قیمت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا) (۴۷)

یہی موقف دیگر فقہاء کا بھی ہے جو گزشتہ صفحات میں نقل کر دیا گیا ہے۔

قرض کے حوالے سے آخری بات جس کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں شخصی ضرورت کیلئے کسی کو قرض دینا اور کسی حاجت مند کی حاجت پورا کرنا ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ انسانیت کی خدمت ہے جس کی ترغیب اسلامی تعلیمات میں جابجا ملتی ہے۔ قرض انسان کی ایک معاشرتی و اخلاقی ذمہ داری بھی ہے یہ بنیادی طور پر ایک غیر مادی فعل ہے اور ایثار و قربانی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ یہ اجر و ثواب کی نیت اور ضرورت مند کی ضرورت کی تکمیل کے مقصد سے دیا جاتا ہے' اسے مادی پیمانوں سے ناپنا مقتضائے شرع نہیں۔ قرض میں قدر یا قوت خرید جیسے مطالبات اس کی اصل روح کے منافی ہیں۔

قرض کو اگر خالص مادی پیمانے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرض دینے والا قدر اور قوت خرید میں کمی کا نقصان ہی نہیں برداشت کرتا بلکہ اس کے علاوہ بھی اسے کئی دیگر نقصان اٹھانا پڑتے ہیں۔ وہ ایک خاص عرصہ کیلئے اپنے اس سرمایہ سے محروم ہو جاتا ہے جسے وہ کسی منفعت بخش کام میں لگا سکتا تھا۔ قرض کو وصول کرنے کیلئے اسے زحمت الگ سے اٹھانا پڑتی ہے۔ مقروض تک پہنچنے کیلئے اخراجات آمدورفت ایک الگ مالی نقصان ہیں۔ بعض اوقات عسرت و تنگدستی کی بنا پر مقروض وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں قرضخواہ کو مزید انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ان تمام مادی وغیر مادی نقصانات کے باوجود اسلام نے قرض دینے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور اجر وفضیلت کے اعتبار سے اسے صدقہ سے بڑا عمل قرار دیا ہے کیونکہ یہ کسی انسان کی مشکل میں مدد کرنا ہے لہٰذا اسلامی تعلیمات کی رو سے اگر کسی نے شخصی ضرورت کیلئے کسی کو قرض دینا ہے تو وہ خالصتاً اجر و ثواب اور مدد و تعاون کے نقطۂ نظر سے دے۔

جہاں تک تجارتی مقاصد کیلئے قرض کی فراہمی کا تعلق ہے تو اس کے لئے شریعت نے

قرض کی بجائے مشارکت و مضاربت کے طریقہ ہائے کاروبار تجویز کئے ہیں۔ مشارکت و مضاربت کاروبار کے نتیجہ میں ایک فرد نہ صرف اپنے سرمایہ کی قدر محفوظ کر سکتا ہے بلکہ اپنے سرمایہ پر مزید اسے نفع بھی مل سکتا ہے۔

امید ہے ان حقائق کی روشنی میں فاضل مقالہ نگار اشاریہ بندی سے متعلق اپنے موقف پر نظرثانی فرمائیں گے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ بلاذری: ابو الحسین ' احمد بن یحیی بن جابر البلاذری' فتوح البلدان' ترجمہ: مولوی سید ابو الخیر المودودی' نفیس اکیڈمی' کراچی' د. ت جلد ۲ ص ۲۴۴۔

۲۔ مالک بن انس' المدونۃ الکبری (روایۃ سحنون) دار صادر' بیروت' د. ت. جلد ۸ ص ۳۹۵۔ ۳۹۶۔

۳۔ مجموع فتاوی ابن تیمیہ' جمع و ترتیب: عبدالرحمن بن محمد بن قاسم' مطابع ریاض و دار العربیۃ۔ بیروت ۱۳۹۸ھ' جلد ۲۹ ص ۷۱ ۴۔ ۴۷۲۔

۴۔ فتوی ادارات البحوث العلمیہ والافتاء والدعوہ ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ' مطبوعہ: الورق النقدی' از الشیخ عبداللہ بن سلیمان بن منیع' ریاض' اشاعت دوم' ۱۴۰۴ھ / ۱۹۸۴ء ص ۱۳۴

۵۔ القرضاوی: یوسف القرضاوی' فقہ الزکوۃ (اردو ترجمہ)' البدر پبلیکیشنز لاہور و ادارہ معارف اسلامی' ۱۹۸۲ء' جلد ۲ ص ۵۱۔

۶۔ القرضاوی: فوائد البنوک ھی الربا المحرم' اردو ترجمہ بعنوان "ربوا اور بینک کا سود" از جناب عتیق الظفر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۱۹۹۳ء' ص ۴۰ (اردو ترجمہ)۔

۷۔ علامہ رشید رضا: یسر الاسلام و اصول التشریع۔ مطبعۃ المنار' مصر. د. ت. ص ۶۱۔

۸۔ تقی عثمانی: مولانا تقی عثمانی' کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم۔' میمن اسلامک پبلشرز' کراچی' ص ۲۷۔

۹۔ الزحیلی: ڈاکٹر وھبہ الزحیلی' الفقہ الاسلامی فی اسلوبہ الجدید' مطابع جامعہ دمشق' د. ت' جلد ۱ ص ۶۱۸۔

۱۰۔ اسلامی فقہ اکیڈمی' قرار دادیں اور سفارشات (۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۳ء)' اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ' ص ۵۲۔

۱۱۔ اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی معاشیات کے زیر اہتمام سیمینار بعنوان "انڈیکیشن اور اسلامی معیشت پر اس کے اثرات" منعقدہ ۲۵ - ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء کی سفارشات ' سفارش نمبر ۴ (غیر مطبوعہ)۔

۱۲۔ (i) خرشی: محمد الخرشی' شرح مختصر الخلیل مع حاشیۃ الشیخ العدوی' المطبعۃ الامیریہ الکبری' بولاق' اشاعت دوم' ۱۳۱۷ھ' جلد ۵ ص ۵۶۔

(ii) النووی: محی الدین بن شرف النووی' المجموع شرح المھذب' ناشر: زکریا علی یوسف' القاہرہ' د. ت' جلد ۹ ص ۴۴۷۔

۱۳۔ شوکانی: محمد بن علی بن محمد الشوکانی' نیل الاوطار' انصار السنۃ المحمدیہ لاہور' د. ت' جلد ۵' ص ۲۳۳۔

۱۴۔ ابن قیم الجوزیہ' الطرق الحکمیۃ' تحقیق : د. محمد جمیل غازی' مطبعۃ المدنی' ۱۹۷۷ء ' ص ۳۷۳ - ۳۷۴۔

۱۵۔ (i) الزحیلی : ڈاکٹر وھبہ الزحیلی' اصول الفقہ الاسلامی' دار الفکر دمشق' اشاعت اول' ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء جلد ۱ ص ۶۴۸۔

(ii) زیدان: ڈاکٹر عبدالکریم زیدان' الوجیز فی اصول الفقہ' دار الکتب الاسلامیۃ' لاہور' د. ت' ص ۲۰۳۔

۱۶۔ الزحیلی' حوالہ سابق' جلد ۱ ص ۶۴۹

۱۷۔ زیدان' حوالہ سابق ص ۲۰۳۔

۱۸۔ الزحیلی' الفقہ الاسلامی و ادلتہ' دار الفکر' دمشق' جلد ۴ ص ۶۷۶۔

۱۹۔ ابن رشد: ابو الولید محمد بن احمد بن احمد ابن رشد' بدایۃ المجتھد' مکتبہ علمیہ لاہور' اشاعت دوم' جنوری ۱۹۸۴ء' جلد ۲ ص ۹۹۔

۲۰۔ ابن عابدین' ردالمحتار' ناشر: ایچ - ایم - سعید کمپنی' د. ت جلد ۵ ' ص ۱۶۱۔

۲۱۔ الجزیری : عبدالرحمن الجزیری' کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ ' داراحیاء التراث العربی' بیروت' اشاعت ششم' جلد ۳ ص ۳۳۸

۲۲۔ ابن قدامہ' عبداللہ بن احمد بن قدامہ ' المغنی' دار الفکر' مسئلہ نمبر ۳۲۶۱' جلد ۲ ص ۱۱۹۔

۲۳۔ خطیب: محمد الشربینی الخطیب' مغنی المحتاج' المکتبۃ التجاریہ الکبری' مصر' د. ت' جلد ۲۔ ص ۱۱۹۔

۲۴۔ ابن قدامہ' حوالہ سابق' مسئلہ نمبر ۳۳۲۶' جلد ۴ ص ۲۱۰۔

۲۵۔ کاسانی: علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی' بدائع الصنائع' مکتبہ رشیدیہ' کوئٹہ' اشاعت اول ۱۳۲۸ء ۱۹۱۰ء' جلد ۴ ص ۱۸۴ ۔ ۱۸۵۔

۲۶۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں : "الذھب بالذھب والفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل یدابید"۔ نیل الاوطار للشوکانی' ناشر: انصار السنۃ المحمدیہ' لاہور' د۔ت جلد ۵ ص ۲۰۲۔

۲۷۔ ابن قدامہ' حوالہ سابق جلد ۴ ص ۲۱۰

۲۸۔ مولانا تقی عثمانی' حوالہ سابق' ص ۵۱

۲۹۔ ابن قدامہ' حوالہ سابق' مسئلہ نمبر ۳۲۶۹' جلد ۴ ص ۲۱۴۔

۳۰۔ ابن عابدین' رسائل ابن عابدین' رسالۃ تنبیہہ الرقود فی مسائل النقود' سہیل اکیڈمی لاہور' ۱۹۸۰ء' جلد ۲ ص ۶۲

۳۱۔ عبدالرحمن الجزیری' کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعہ' داراحیاء التراث العربی' بیروت جلد ۳' ص ۳۳۸۔

۳۲۔ رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل بعنوان "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ" ۱۹۸۰ء ' المرکز العالمی لابحاث الاقتصاد الاسلامی' اپریل ۱۹۸۲ء آرٹیکل (۱ ۔ ۱۰) ص ۲۹ ۔ (عربی ترجمہ)

۳۳۔ نیل الاوطار' حوالہ سابق جلد ۵ ' ص ۲۰۴۔

۳۴۔ ابن عابدین' ردالمحتار' جلد ۵' ص ۶۰۔

۳۵۔ رافعی : عبدالکریم بن محمد الرافعی' فتح العزیز شرح الوجیز' مطبعۃ التضامن الاخوی' د۔ت جلد ۸ ص ۱۳۹۔

۳۶۔ ابن بخار : تقی الدین محمد بن احمد الفتوحی' منتھی الارادات' تحقیق : عبدالغنی' عالم الکتب' د۔ت جلد ۱' ص ۳۴۵۔

۳۷۔ مجموعہ سفارشات سیمینار بابت "انڈیکیشن اور اسلامی معیشت پر اس کے اثرات" زیر اہتمام اسلامی ترقیاتی بینک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ اسلامی اقتصادیات ' منعقدہ ۲۵ تا ۲۸ اپریل ۱۹۸۷ء ' (غیر مطبوعہ)

۳۸۔ رپورٹ اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۸۰ء بابت "ملکی معیشت سے سود کا خاتمہ" آرٹیکل نمبر ۱ (۱۰) اور وفاقی شریعت کا سود سے متعلق فیصلہ' (شریعت پیٹیشن نمبر ۳۰ / آئی / ۱۹۹۰ء بابت قانون سود ۱۸۳۹ء)۔ آرٹیکل نمبر ۱۶۳ تا ۲۰۱۔

۳۹۔ ڈاکٹر حسن زمان' Indexation of Financial Assets ' ناشر: المعھد العالمی للفکر الاسلامی' اسلام آباد' ص ۴۴۔

۴۰۔ دیکھئے : (i) ڈاکٹر عمر چھاپرا' "Towards a Just Monetary System" ' اسلامک فاونڈیشن لیسٹر' برطانیہ' ۱۹۸۵ء ' ص ۳۹۔ ۴۰:

(ii) ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی' "Issues in Islamic Banking" ' اسلامک فاونڈیشن ' لیسٹر' برطانیہ' ۱۹۸۳ء ' ص ۴۱۔ ۴۴

(iii) ڈاکٹر حسن زمان' "Indexationof Financial Assets" صفحات ۳۸ تا ۵۰۔

(iv) مولانا تقی عثمانی' کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم' مرجع سابق ۔ صفحات ۴۵ تا ۸۵

(v) مولانا گوہر رحمن' تفہیم المسائل' جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن ' مردان' فروری ۱۹۹۳ء ص ۳۱۴۔ ۳۱۶۔

(vi) ڈاکٹر محمود غازی "Indexation and Inflation" ' پاکستان بینکر" میں شائع شدہ مقالہ جنوری ۱۹۹۳ء۔

(vii) ایس ۔ این ۔ ایچ نقوی' ,Ethics and Economics اسلامک فاونڈیشن ہسٹر ۱۹۸۱ء ص ۱۲۱۔۱۲۲۔

۴۱۔ محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر' مختار الصحاح' موسۃ علوم القرآن ' بیروت ' د۔ ت ' ص ۵۱۰۔ ۵۱۱

۴۲۔ نیل الاوطار' مرجع سابق' جلد ۵ ص ۲۵۵۔

۴۳۔ ابراہیم یوڈووچ' PartnershiP and Profit in Medieval Isam پرنٹس یونیورسٹی پریس' نیو جرسی' ۱۹۷۰ء ص ۵۲۔

۴۴۔ رملی: شمس الدین محمد بن احمد الرملی' نهایہ المحتاج الی شرح المنهاج' المطبعہ البھیتہ المصریہ ' ۱۳۰۴ھ ' جلد ۳ ص ۴۳۳۔

۴۵۔ بدائع الصنائع' مرجع سابق' جلد ۵ ص ۲۴۲۔

۴۶۔ مجموعۃ رسائل ابن عابدین' رسالہ تنبیہہ الرقود فی مسائل النقود ' سہیل اکیڈمی لاہور اشاعت دوم' ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء جلد ۲ ص ۶۲۔

۴۷۔ الشیخ عبدالقادر محمد حسب اللہ الحسینی الحنفی ' تراجع سعر النقود بالامر السلطانی ' تحقیق: نزیہ حماد مجلہ ابحاث الاقتصاد الاسلامی' العدد الثانی' المجلد الثانی ' ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء۔

★★★